باری علیگ

باری صاحب سے میں پہلی بار ملا تو اُن سے متاثر نہ ہوا۔

میں اُن کی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' پڑھ چکا تھا۔ اس کتاب نے بھی مجھے متاثر نہ کیا تھا لیکن جب مکتبہ اُردو نے اُن کی کتاب ''تاریخ کا مطالعہ'' چھاپی اور میں نے پڑھی تو میں باری صاحب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ...لیکن باری صاحب اس دُنیا میں نہیں تھے۔

باری صاحب کو میں نے پہلی بار ''احسان'' اخبار کے دفتر میں دیکھا۔ یہ قیامِ پاکستان سے دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ میں ایف اے سے بھاگ کر روزنامہ احسان کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ احمد بشیر بھی تھے اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اس اخبار کے چیف رپورٹر تھے۔

باری صاحب اخبار کے چیف ایڈیٹر تھے اور اُن کے ساتھ خلیل صحافی غالباً نائب مدیر تھے۔ لاہور اور امرتسر کے درمیان ایک باؤ ٹرین چلا کرتی تھی۔ کلرک اور دوسرے نوکر پیشہ لوگ اس ٹرین کے ذریعے روزانہ صبح لاہور آتے اور شام کو اسی ٹرین سے واپس امرتسر چلے جاتے۔ میں بھی روزانہ اسی ٹرین میں بیٹھ کر لاہور آتا۔احسان اخبار میں دن بھر کام کرتا اور شام کو اسی ٹرین سے واپس امرتسر چلا جاتا۔

بڑے دلچسپ لوگ اسی ٹرین میں سفر کیا کرتے تھے۔ اسی ٹرین پر میں نے ایک افسانہ بھی لکھا تھا۔ ہمیں اس سفر کیلئے ریلوے والوں کو تھوڑے سے پیسے دے کر ہر مہینے ایک پاس بنوانا پڑتا تھا۔ مگر میں گھر سے پاس کی رقم لے کر اُڑا دیتا تھا اور ہمیشہ امرتسر سے لاہور تک بلا ٹکٹ سفر کرتا تھا۔ میں نے بڑے بڑے مدبر آدمیوں کو اس گاڑی میں ہمیشہ بلا ٹکٹ سفر کرتے دیکھا۔ ایک لحیم شحیم کشمیری بزرگ تھے۔ موتیا رنگ کی شیروانی، شلوار اور سُرخ ترکی ٹوپی پہنے رہتے تھے۔ سرخ و سپید رنگت تھی۔ دیکھنے میں کسی چھوٹی سی ریاست کے نواب لگتے تھے لیکن ہمیشہ بغیر ٹکٹ سفر کرتے تھے۔ ایک روز ہیڈ کوارٹر کے چیکروں نے ٹرین پر حملہ کیا تو ان ''نواب صاحب'' کو چوروں کی طرح ریل گاڑی کی پٹڑیوں پر بھاگتے دیکھ کر مجھے ذہنی صدمہ ہوا تھا۔

میرے ساتھ ظہور الحسن ڈار ہوتا تھا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھا۔ اس کی جیب میں ریلوے کا پاس ہوتا۔ ویسے بھی وہ بڑا دور اندیش تھا اور میں زیادہ دور کی چیزیں دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ٹکٹ چیکر کو ڈبے میں داخل ہوتا دیکھ کر میں چلتی ٹرین سے دوسرے ڈبے میں چلا جاتا۔ ایک بار ٹرین مغل پورہ اسٹیشن سے باہر آئی تو ہمارے ڈبے میں ٹکٹ چیکر آ گیا۔ میں نے چلتی ٹرین کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ منظر مجھے آج بھی یاد ہے جب میں جھاڑیوں میں قلابازیاں کھاتا گرا اور پھر اُٹھ کر فاتحانہ انداز میں لاہور کی طرف جاتی ٹرین کو دیکھنے لگا تھا۔ ٹکٹ چیکر کھڑکی میں سے سر باہر نکالے مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا... لیکن ایسا ہوتا ہی رہتا تھا... یہ ہمارا کھیل تھا اور ہم اسے کھیلتے رہتے تھے۔

میں احسان اخبار کی بات کر رہا تھا۔ دہلی دروازے کے باہر ایک جہازی بلڈنگ آج بھی موجود ہے۔ اس بلڈنگ میں احسان کا دفتر تھا۔ تنگ اندھیری سیڑھیاں تھیں جس کی ڈیوڑھی میں بجلی کے بے شمار چھوٹے بڑے میٹروں کا ایک اکھڑا ہوا بورڈ تھا جس کے اوپر زرد بھڑوں نے چھتہ بنا رکھا تھا۔ اوپر جا کر کڑیوں والی اونچی چھتوں اور بینگے ٹیڑھے فرشوں والے کمرے تھے۔ بھاری پرانے دروازوں پر لوہے کے کنڈے لٹکتے اور لوہے کی لمبی نالیوں پر لگے پنکھے گردش میں رہتے تھے۔ گرمیوں کی صبحوں کو فرش پانی سے دھوئے جاتے۔ کاتبوں کیلئے دو لمبے تخت دیوار کے ساتھ لگے تھے۔ یہاں نقی کاتب بھی ہوا کرتے تھے جن پر سعادت حسن منٹو نے کہانی لکھی تھی۔ ہیڈ کاتب حسنین صاحب تھے۔ چیچک کے داغ، سانولا رنگ، کھڑے سفیدہ مائل بال اور موٹے شیشے کی عینک۔ حسنین صاحب بڑے ماہر خوش نویس تھے اور اداریہ لکھا کرتے۔ کالم میں چند ایک سطریں کم ہو جاتیں تو وہ آگے اپنے پلے سے لکھ دیا کرتے۔

مثلاً یہ اداریہ جہاں ختم ہوتا وہاں سے آگے وہ یوں اضافہ فرماتے:

> ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر بنیادی مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے کوئی لائحہ عمل بنایا گیا تو ...

ملک نور الٰہی صاحب اخبار کے مالک تھے اور اُن کی آواز ہر کمرے سے آیا کرتی تھی۔ وہ جس کمرے میں ہوں اُن کی آواز اس کے ساتھ والے کمرے میں بھی سُنی جا سکتی تھی۔ موچی دروازے سے قاضی صاحب اکثر ملک صاحب کو ملنے آیا کرتے۔ بھاری بھرکم مدبر اور ثقہ قسم کے بزرگ تھے۔ میں نیوز سیکشن میں اسسٹنٹ کا بھی اسسٹنٹ تھا اور خبروں کا

ترجمہ سیکھ رہا تھا۔

باری صاحب اور خلیل صحافی ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ مجھے اخبار میں آئے دوسرا دن تھا کہ میں نے ایڈیٹر کے کمرے میں ایک بھاری سر والے سانولے آدمی کو دیکھا جس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک چڑھی تھی اور جس کے ہونٹ کالے کالے تھے۔ یہ صاحب میز پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے۔

احمد بشیر نے مجھے بتایا کہ یہ باری صاحب ہیں۔ سنجیدہ، بوجھل، آلکسی جسم تھا۔ نقش و نگار موٹے تھے اور بظاہر کوئی بات متاثر کرنے والی نہیں تھی۔ کبھی کبھی اُن کے دوست ملنے آتے تو کمرے سے باری صاحب کے قہقہوں کی آواز گونجا کرتی۔

میں اخبار احسان چھوڑ کر کلکتے چلا گیا۔ لوئرچت پور روڈ کی گلیوں میں بنگالی لڑکیوں کو بالوں میں جوڑے سجائے مندروں کو جاتا دیکھتا اور صبح صبح اُن کے گھروں سے آنے والے رابندر سنگیت کی مدھر تانیں سُنتا۔ وکٹوریہ میموریل میں غدر کے زمانے کی تصویریں اور شاہانِ اودھ کے شاہی لباس شیشے کی الماریوں میں لگے دیکھتا۔ شام کو 'کولو ٹولہ اسٹریٹ' کے ٹھنڈے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتا ... دریائے ہگلی کی طرف سے آنے والی مرطوب ٹھنڈی ہوائیں مجھے اپنے پاس بلایا کرتیں۔

پھر میں کلکتے سے ایک بحری جہاز میں سوار ہو کر برما چلا گیا۔

رنگون پہنچا تو وہاں ایک اُردو اخبار ''شیر'' سے منسلک ہو گیا۔ جنگ عظیم اپنے آخری مرحلے میں تھی۔ جاپان' ملایا اور سنگاپور پر قبضہ کرنے کے بعد برما کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رنگون میں رات کو بلیک آؤٹ ہوتا اور ہوائی حملوں کی مشقیں ہوتیں۔ اور پھر ایک روز رنگون کے آسمان پر اچانک جاپانی بمبار نمودار ہوئے اور شہر اور بندرگاہ پر اندھا دھند بمباری شروع ہو گئی۔ رنگون بھیانک زلزلے کی زد میں آ گیا۔ عمارتیں گرنے لگیں۔ بندرگاہ پر کھڑے جہازوں میں آگ لگ گئی۔

رنگون ریڈیو اسٹیشن سے تھوڑی دور ایک مے خانہ تھا۔ ایک بم اس مے خانے پر گرا اور ریڈیو اسٹیشن کا ایک اسٹوڈیو بھی تباہ ہو گیا۔ رنگون میں حالات بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے ایک بحری جہاز پکڑا اور رنگون سے چل پڑا۔ کالے پانی کا یہ سفر بڑا خطرناک تھا۔ ہر آن جاپانی آبدوزوں کے حملے کا دھڑکا لگا رہتا۔ رات کو جہاز پر بلیک آؤٹ کر دیا جاتا۔ اگر جاپانی آبدوز کا تارپیڈو اس جہاز کو آ کر لگ جاتا تو دُنیا کی کوئی طاقت جہاز کے عملے

اور مسافروں کو سمندری موت سے نہیں بچا سکتی تھی۔ یہ ایک چینی چھوٹا جہاز تھا اور اس پر بچاؤ کے انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے۔ خدا خدا کر کے ہم لوگ کلکتے پہنچ گئے۔

ان ہی دنوں باری صاحب رنگون آ کر اخبار ''شیر'' اور ''مجاہد برما'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اُن کے ساتھ کیپٹن ممتاز ملک[۱] بھی تھے۔ باری صاحب کو میں رنگون میں نہ دیکھ سکا۔ اُن کے رنگون پہنچنے کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی جاپانی فوجیں برما میں داخل ہو گئیں اور وہاں سے بھاگنے کے بحری اور ہوائی راستے مسدود ہو گئے۔ چنانچہ باری صاحب اپنی بیگم اور چھوٹی سی بچی سعیدہ کے ساتھ قافلے میں شریک ہو کر چالیس پچاس دنوں کے ہمت شکن بھیانک سفر کے بعد کاکس بازار پہنچے۔ میری بڑی ہمشیرہ بھی اپنے خاوند کے ہمراہ اسی قافلے میں سفر کر رہی تھیں۔ یہ سفر جنگلوں، دلدلوں، ندی نالوں، دریاؤں اور آبناؤں کا دہشت ناک سفر تھا اور ہزاروں لوگ اپنے اپنے گھر بار لٹا کر قافلہ در قافلہ ہاتھیوں، شیروں، سانپوں، اژدہوں اور برمی خونخوار ڈاکوؤں کے حملے برداشت کرتے کاکس بازار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمشیرہ نے امرتسر پہنچ کر اس اندوہناک سفر کی روئیداد سنائی تو بتایا کہ باری صاحب سارا راستہ اپنی بچی کیلئے پریشان رہے۔ جب بھی جاپانی بمبار جہازوں کی ٹولی قافلے کے اوپر سے گزرتی تو باری صاحب اپنی بچی کو سینے سے لگا کر کسی درخت کے نیچے چھپ جاتے۔ یہ سفر باری صاحب کی زندگی کا اذیت ناک ترین سفر تھا جس کی بھیانک یادیں اُن کی زندگی کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہیں۔

امرتسر کے ہال بازار میں شیراز ہوٹل ہوا کرتا تھا جہاں ہمارے ہوش سے پہلے اختر شیرانی، سعادت حسن منٹو اور باری صاحب اپنی رنگا رنگ محفلیں گرم کیا کرتے تھے۔ یہیں باری صاحب سب سے پہلے سعادت حسن منٹو کو ایک ادیب کی حیثیت سے دُنیائے ادب میں لائے۔ اسی شہر سے اُنہوں نے ''روسی نمبر'' شائع کیا جس کیلئے سعادت حسن منٹو نے کئی روسی افسانوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ جب ہم نے ہوش سنبھالا تو یہ ہوٹل قصہ پارینہ بن چکا تھا لیکن اس شہر کی فضا میں باری صاحب کی یادوں کی مہک ابھی باقی تھی اور انور آرٹسٹ کی دکان میں اکثر ان کی باتیں ہوتی تھیں۔

پاکستان بننے کے بعد میں نے باری صاحب کو دوسری بار عرب ہوٹل میں دیکھا۔ عرب ہوٹل میں ایک ادبی بیٹھک تھی جہاں ہم سے پہلے کے ادیب شاعر اور دانشور بیٹھا کرتے تھے۔ میں اپنے ایک دوست سے ملنے اسلامیہ کالج کے ہوسٹل میں گیا تو وہ مجھے لے کر

عرب ہوٹل آ گیا۔ میں نے باری صاحب کو اپنے کسی ہم عصر دوست کے ساتھ باتیں کرتے اور چائے پیتے دیکھا۔ اُن کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی اور جسم پہلے سے بھاری ہو گیا تھا۔ نہ اُنہوں نے مجھے پہچانا اور نہ میں نے اُن سے کوئی بات کی۔

پھر ایک روز اُنہیں نگینہ بیکری میں دیکھا۔ وہ مولانا صلاح الدین کے پاس بیٹھے تھے۔ میرے دو تین افسانے شائع ہو چکے تھے اور اُردو ادب میں میں نے اپنا مقام بنا لیا تھا۔

میں نے مولانا صلاح الدین احمد کو ادب سے سلام کیا اور ساتھ ہی باری صاحب کو بھی تعظیماً سلام پیش کیا۔ مولانا نے باری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

باری صاحب مسکرائے اور میری طرف دیکھ کر فرمایا:

''ادبِ لطیف میں تمہارا افسانہ پڑھا تھا۔ ماشاء اللہ بڑے ہونہار افسانہ نگار ہو۔ بیٹھو چائے پیئو ہمارے ساتھ۔''

یہ میرے لیے بڑی عزت افزائی کا مقام تھا۔ میں ان دونوں بزرگ دانشوروں کے پاس بڑے ادب سے سمٹ کر بیٹھ گیا اور ان کی باتیں بڑے غور سے سُننے لگا۔

مولانا صلاح الدین احمد، میرا جی کے کسی مضمون کی بات کر رہے تھے اور اس کے بعض فنی پہلوؤں پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ فرما رہے تھے۔ باری صاحب بڑے غور سے اُن کے خیالات سُن رہے تھے اور ساتھ ساتھ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش بھی لگا رہے تھے۔ میں کبھی مولانا صاحب اور کبھی باری صاحب کو دیکھ رہا تھا اور اُن کے ایک ایک لفظ کو بڑے دھیان سے سُن رہا تھا۔ ادب کے یہ وہ بزرگ تھے جو نیچرل طریقے سے پختہ عمر کو پہنچے تھے۔ آج کے بزرگوں کی اکثریت غیر قدرتی ماحول کی وجہ سے بوڑھی ہوئی ہے بزرگ ہوئی ہے۔ اُن کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کوئی نوجوان کسی زبردست صدمے سے اچانک بوڑھا ہو گیا ہے یا کسی اداکار نے بوڑھے آدمی کا روپ دھار رکھا ہو۔

موچی دروازے کے بالمقابل بھی ایک جہازی بلڈنگ ہے ۔ یہاں بھی ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ میں اس ہوٹل کا اس کے مالک کا نام بھول گیا ہوں۔

یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ وہ صاحب بڑے خوش شکل اورصحت مند تھے اور ادب سے اُنہیں بڑا لگاؤ تھا۔ اسی ہوٹل کی دوسری منزل پر بالکل 'احسان' اخبار کے دفتر کی طرح کا ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں ایک بار میں امرتسر سے سیف الدین سیف کے ساتھ آیا تھا۔ یہاں بھی میں نے باری صاحب کو اور منٹو صاحب کو دیکھا تھا۔ ان کے ایک مشترکہ دوست

غلام عباس[۲] بھی وہاں موجود تھے۔ یہ وہی غلام عباس ہیں جنہوں نے حال ہی میں سیارہ ڈائجسٹ میں سعادت حسن منٹو کے فن اور اُن کی شخصیت پر ایک بڑا معرکے کا مضمون لکھا ہے۔ غلام عباس کمرے کی میز پر دیوار کی طرف منہ کیے کچھ لکھ رہے تھے۔ باری صاحب اور منٹو صاحب کرسیوں پر بیٹھے تھے اور نیم عریاں تھے۔ شاید اس لیے کہ گرمی کا موسم تھا۔

سیف اُن سے باتیں کرتے رہے اور میں کبھی باری صاحب اور کبھی سعادت حسن منٹو کو باتیں کرتے دیکھتا رہا۔

جیسا کہ میں نے لکھا ہے نگینہ بیکری میں باری صاحب سے میرا پہلا باقاعدہ بالمشافہ تعارف ہوا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میں نے ''احسان'' اخبار میں بھی اُن کی سرپرستی میں کام کیا ہے۔ وہ کہنے لگے:

''اگر افسانہ لکھنا چاہتے ہو تو اخبار میں کبھی نوکری نہ کرنا۔''

نگینہ بیکری سے کافی ہاؤس تک باری صاحب کا ایک بھرپور سفر ہے۔ یہ ان کی زندگی کا آخری دور تھا۔ مجھے آج بھی اس بات پر فخر ہے کہ باری صاحب نے میرے ایک افسانے پر مجھے بہت داد دی تھی اور میری حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ یہ نگینہ بیکری والی ملاقات کے بعد کا واقعہ ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس میں مجھے افسانہ پڑھنا تھا۔ باری صاحب بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ جب تنقید کا دور شروع ہوا تو باری صاحب نے میری کہانی کے مختلف پہلوؤں پر بات کی۔ اجلاس کے بعد میں وائی ایم سی اے ہال سے باہر نکلا تو باری صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''تم نے بہت اچھا افسانہ لکھا ہے۔ میں بہت خوش ہوا ہوں۔ اسی طرح محنت سے لکھتے جاؤ۔''

اُن کی حوصلہ افزائی سے میں نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی تھی لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ان کی کتاب 'تاریخ کا مطالعہ' میں نے ابھی نہیں پڑھی تھی۔ میرے نزدیک اُن کی حیثیت اس وقت ایک دانشور اور مشفق بزرگ کی تھی جو نئی نسل کے ادیبوں، شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ نہ تو میں اُن کا ہم عمر اور دوست تھا کہ ان کی زندگی کے بعض پوشیدہ پہلو اجاگر کرتا اور نہ مجھے اُن کی کتابوں 'کمپنی کی حکومت' اور 'کارل مارکس' اور 'لینن' نے متاثر کیا تھا۔ ہاں وہ مجھے ایک دلچسپ انسان ضرور لگتے تھے کیونکہ وہ بات بڑی گہری اور انوکھی کرتے تھے۔

مجھے اب اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ باری صاحب کے ساتھ میری ملاقاتوں کا عہد اُن کی اصل شخصیت کو پہچانے بغیر ہی گزر گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے باری صاحب کی گفتگو اور باتوں سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن اگر میں نے اس وقت اُن کی معرکۃ الآرا کتاب 'تاریخ کا مطالعہ' پڑھی ہوتی تو پھر میں اُن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرتا اور اُن سے اور بہت کچھ پوچھتا۔

میں ان سے پوچھتا کہ اُنہوں نے کہاں اور کس جگہ بیٹھ کر یہ کتاب لکھی تھی؟ اور جب حمورّبی اخلاقیات کے اُصول مرتب کر رہا تھا تو وہ وادیٔ بابل کے کس گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ میں اُن سے پوچھتا کہ جب اُنہوں نے اس کتاب میں عرب کا باب ختم کیا تو آخری جملے لکھتے وقت اُن کے دلی جذبات کیا تھے۔

لیکن میں اُنہیں شناخت نہیں کر سکا تھا اور وہ ہم سے بچھڑ گئے ۔ ہمیشہ کیلئے۔

کافی ہاؤس میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے ۔ میں کافی ہاؤس کی ٹھنڈی اندھیری فضا میں داخل ہوتے ہوئے اُنہیں دیکھ کر دور سے تعظیماً سلام کرتا اور وہ مسکرا کر جواب دیتے اور کبھی اپنے پاس بلا کر خیریت پوچھتے اور میرا بازو دبا کر کہتے:

''کیا لکھ رہے ہو آج کل؟ کوئی تازہ کہانی لکھی؟''

اُن دنوں وہ برٹش ہائی کمشنر کے دفتر میں شعبہ تعلقات عامہ اور اطلاعات کے انچارج تھے۔ پہلی بار میں کسی کام سے برٹش ہائی کمشنر کے دفتر میں گیا تو خیال آیا کہ باری صاحب بھی وہیں موجود ہیں، اُن سے نیاز حاصل کرتا جاؤں۔ ایک چپڑاسی سے پوچھا۔ وہ مجھے باری صاحب کے پاس لے گیا۔ ایک بڑی میز پر کئی رسالے کتابیں اور کاغذات پڑے تھے۔ ٹیبل لیمپ روشن تھا اور باری صاحب میز پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے۔میں کمرے میں داخل ہوا تو اُنہوں نے اپنا بھاری بھرکم سر اُٹھا کر انتہائی سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور پھر مسکرائے: ''بیٹھو۔''

اور دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔ کمرے میں بڑی خاموشی تھی ۔ایک تو وہ علاقہ ہی بڑا خاموش تھا اوپر سے کوٹھی بڑی کشادہ تھی۔ دور سڑک پر سے گزرتی کار کی آواز بھی وہاں نہیں آ سکتی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں نہ اتنی کاریں تھیں، نہ رکشے تھے اور نہ ہی کوئی اسکوٹر لاہور میں آیا تھا۔ فضا میں بڑے اعلیٰ تمباکو کی دھیمی دھیمی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوشبو نے مجھے سگریٹ پینے کیلئے مجبور کیا۔ میں نے جیب سے گولڈ فلیک کی ڈبی نکال کر بڑی

خاموشی سے ایک سگریٹ سلگالیا۔ باری صاحب نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا:

''صرف دو منٹ اور لوں گا۔''

''کوئی بات نہیں باری صاحب۔ بلکہ میں معذرت چاہوں گا کہ آپ کی دفتری مصروفیات میں ...''

''اونہوں ... یہ کام ہوتا رہتا ہے۔ صرف دو منٹ۔''

اُنہوں نے اُنگلی اُٹھا کر مجھے کہا اور اپنی سنہری فریم کی عینک ناک پر جماتے ہوئے پھر لکھنے لگے۔ پھر اُنہیں کچھ خیال آیا اور میری طرف دیکھ کر پوچھا: ''کافی پیو گے یا چائے۔''

''چائے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ کیونکہ اس کمرے کے انگریزی ماحول کا تقاضا تھا کہ میں بہترین خوشبودار برٹش بلنڈڈ چائے پیوں۔ چپڑاسی نے چائے کی ٹرے لا کر بڑی خاموشی سے تپائی پر رکھ دی۔ باری صاحب نے اُسے چائے بنانے کا اشارہ کیا۔ میں نے چپڑاسی کو روک دیا اور خود اُٹھ کر چائے بنائی۔ چائے برٹش بلنڈڈ تھی اور اس کی مہک چینک سے طلوع ہونے سے پہلے ہی اُڑنے لگی تھی۔ یہ چائے سے پہلے چائے کی خوشبو تھی۔ سورج سے پہلے سورج کی روشنی تھی۔ اور پگھلا ہوا سورج پیالیوں میں گرنے لگا۔

روشنی ... روشنی ... اور روشنی!

باری صاحب نے کام چھوڑ دیا تھا اور چائے پی رہے تھے۔

میں نے کہا: ''چائے بڑی اچھی ہے۔''

''ہوں۔''

معلوم ہو رہا تھا کہ وہ چائے پیتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ہیں۔

کمرے کی فضا خاموش تھی۔ سوائے چائے کی خوشبو کے وہاں اور کوئی احساس نہ تھا۔ اس خوشبو میں گولڈ فلیک کا فلیور مخلوط ہو گیا تھا۔ باری صاحب گہری محویت سے نکل آئے تھے۔ اُنہوں نے پیالی کے کناروں پر آہستہ اُنگلی پھیرتے ہوئے کہا:

''تم نے گوئٹے پڑھا ہے؟ اگر نہیں پڑھا تو اُسے ضرور پڑھو۔''

وہ تاریخ کے آدمی تھے اور تاریخ پر کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ میں نے بھی کمپنی کی حکومت کا ذکر نہ چھیڑا کیونکہ مجھے اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ غالباً ان دنوں وہ 'تاریخِ عالم' لکھ رہے تھے اور 'تاریخ کا مطالعہ' کتاب مکتبہ اُردو والوں کو دے چکے تھے اور وہ پریس میں تھی۔ مگر اُنہوں نے اس بارے میں بھی کوئی بات نہ کی۔ شاید اُن کا خیال ہو

کہ اس قسم کی کتابوں سے ایک نوجوان افسانہ نگار کو کیا دل چسپی ہو سکتی ہے۔ باری صاحب گوئٹے، اقبال اور رومی پر گفتگو کرتے رہے اور مجھے بار بار تاکید کر رہے تھے کہ میں اُنہیں ضرور پڑھوں۔ پھر کہنے لگے:

''تم باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔ تمہیں یورپ کا سفر کرنا چاہیے۔ نوجوان ہو۔ تم وہاں سے بہت کچھ حاصل کرو گے۔ برطانیہ جانے کے سلسلے میں اگر کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے ضرور بتانا۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔''

میں لارنس باغ میں سے ہو کر واپس ٹی ہاؤس جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ باری صاحب کی باتوں میں کتنی شفقت اور خلوص تھا۔ بڑی دھیمی دھیمی نیم گرم باتیں تھیں اُن کی جیسے بانس کے کسی گھنے کنج میں کوئی چھوٹی سی آبشار گر رہی ہو۔

پُرسکون سرگوشیوں والی آبشار۔

ایک روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میں انارکلی کی طرف سے ٹی ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے کافی ہاؤس کے سامنے سے گزرا تو سوچا انور جلال کو دیکھا چلوں، شاید وہ بیٹھا ہو۔ میں کافی ہاؤس میں آ گیا۔ خلافِ معمول وہاں رش نہیں تھا۔ دو تین میزوں پر کچھ لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ میری نظر باری صاحب پر پڑی۔

وہ ذرا پرے دیوار کے ساتھ والی میز پر اکیلے ہی بیٹھے کافی پی رہے تھے۔

میں نے قریب جا کر سلام کیا اور اُن سے اجازت لے کر بیٹھ گیا۔

''کافی پیو گے نا؟''

اُنہوں نے بیرے کو کافی لانے کیلئے کہا اور گہری خاموش سنجیدہ نگاہوں سے باہر دیکھنے لگے۔ وہ گہری سوچ میں مگن تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے دخل در معقولات کیا ہے۔ میں نے دبی زبان میں اس کا اظہار کیا تو وہ مسکرائے۔

بڑی اداس مسکراہٹ تھی۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔

''نہیں نہیں۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔''

پھر اُنہیں نے میری دلچسپی کی باتیں شروع کر دیں۔ کیا لکھ رہے ہو؟ تازہ کہانی کون سے رسالہ میں چھپ رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

پھر اچانک میری طرف دیکھ کر پوچھا: ''گوئٹے کو پڑھا تم نے؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں۔''

وہ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے تھے۔ جیسے کسی دوسری دُنیا میں گم تھے اور وہاں سے پل کی پل میرے پاس آتے اور پھر اپنی دُنیا میں گم ہو جاتے تھے۔ بیرا کافی لے آیا اُنہوں نے مجھے کافی بنا کر دی۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے کافی پینے لگا۔

اُنہوں نے ایک گہرا سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور کہا:

''میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آج کل۔''

میں نے فکرمندی سے اُن کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ خیریت تو ہے نا؟

اُنہوں نے مسکرا کر کہا: ''پیٹ میں گرانی رہتی ہے اور کوئی فکر کی بات نہیں۔''

اب میں نے اُنہیں غور سے دیکھا۔ وہ عینک کے شیشے صاف کر رہے تھے اور مجھے اُن کی آنکھوں کے سیاہ حلقے صاف نظر آ رہے تھے۔ اُن کا رنگ زردی مائل سانولا ہو رہا تھا۔ وہ بیمار تھے ۔اُنہیں کوئی بیماری اندر ہی اندر گھلا رہی تھی۔ وہ اس بیماری سے خائف تھے۔ وہ میرے بزرگ تھے، مجھے کیا بتاتے کہ اُنہیں کون سا مرض لاحق ہے۔ اُن کے مرض سے باری صاحب کے قریبی دوست واقف تھے۔ لیکن اُن کے قریبی دوست اُن کے زیادہ قریب نہیں رہتے تھے۔ وہ کچھ اکیلے اکیلے سے ہو گئے تھے۔ تنہائی کے شدید احساس نے اُنہیں اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ یہ میرا اندازہ ہے۔ ویسے اس سلسلے میں باری صاحب نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ان میں پرانے بزرگوں ایسی وضع داری اور رکھ رکھاؤ تھا۔ یہ اس پرانی نسل کے آخری چراغ تھے کہ بغیر تیل کے جلتے رہتے تھے لیکن کیا مجال جو کسی کو ذرا بھی خبر ہونے دیں کہ دیئے میں تیل نہیں ہے، خالی بتی جل رہی ہے۔

اس وقت کافی ہاؤس میں وہ میرے سامنے کرسی سے پشت لگائے بیٹھے تھے اور مجھے اُن پر دیئے کی خالی بتی کا گمان ہو رہا تھا جو تیل کے بغیر جل رہی تھی اور جس کی روشنی، جس کی مہک، جس کی چمک، جس کی بھڑک آخری دموں پر تھی۔

پھر باری صاحب نے ایک ایسا سوال کر دیا جس کی مجھے اُن سے کم از کم اس وقت توقع نہیں تھی:

''تمہارا امرتسر میں کونسا محلّہ تھا۔''

میں نے اپنے محلہ کا نام لیا تو کہنے لگے: ''وہ تو ہال بازار کے پہلو میں ہی تھا۔ کیا تم کبھی شیراز ہوٹل میں گئے تھے۔ مگر تم تو بہت چھوٹے ہو گے؟''

وہ اپنے آپ سے گویا باتیں کرنے لگے تھے۔ میں خاموشی سے اُنہیں سُن رہا تھا۔

''شیراز ہوٹل میں ہم نے بڑے بڑے یادگار دن گزارے۔ امرتسر اچھا شہر تھا۔ درخت بڑے تھے۔ شہر میں کمپنی باغ کافی کشادہ تھا۔ ایک نہر بھی اس میں بہتی تھی۔''

باری صاحب پرانی یادوں کی تجدید کر رہے تھے، بیتے دنوں کو یاد کر رہے تھے۔ اپنے پرانے دوستوں کو آواز دے رہے تھے۔ وہ دوست جو اُنہیں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ جن کے ساتھ اُنہوں نے بڑی وفا کی تھی، بڑا ایثار کیا تھا۔ شاید وہ باری صاحب کو بھول گئے تھے۔ ان کی باتوں میں اس احساس کی جھلک نمایاں تھی مگر اُن کی زبان پر حرفِ شکایت نہیں تھا۔ پھر اُنہوں نے فارسی کا ایک مصرعہ پڑھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کا مفہوم کچھ اس قسم کا تھا کہ بہار میں بلبل چمن میں آ کر پھولوں کا منہ چومتی ہیں مگر خزاں میں وہ چمن کو چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

کافی ہاؤس کی فضا سوگوار لگ رہی تھی۔ اتنے میں باری صاحب کے چند لطیفے باز قسم کے کچھ دوست آ گئے اور میں اُن سے اجازت لے کر وہاں سے اُٹھ آیا۔ اس کے بعد میں نے باری صاحب کو نہیں دیکھا۔ یہ میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔ جس کی ایک ایک تفصیل میری یادوں کی لوح پر ثبت ہے۔ باری صاحب اس دُنیا سے چلے گئے اور بلبلوں نے اسی خزاں نصیب چمن سے منہ پھیر لیا۔

ایک روز میں مکتبہ اُردو کے دفتر گیا تو چوہدری برکت علی مرحوم کے صاحبزادے نے مجھے سرخ جلد والی ایک کتاب دی جو ٹائپ میں چھپی تھی۔

یہ باری صاحب کی کتاب 'تاریخ کا مطالعہ' تھی۔

کتاب زیادہ ضخیم نہیں تھی۔ میں نے پہلا صفحہ اُلٹا۔ لکھا تھا:

''تاریخ ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہے۔ ہم اس سے سبق حاصل کیوں نہیں کرتے۔''

یہ ایک طرح سے انتساب یا حرفِ اول تھا۔ مجھے اس جملے نے بڑا اپیل کیا۔ میں نے ابواب کی فہرست دیکھی۔ وادیٔ فرات، فرعونوں کا مصر، یونان، روم، ایران۔ میں نے گھر آ کر کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا۔ دو دن لگا کر ساری کتاب پڑھ ڈالی۔

یہاں مجھ پر ایک بالکل ہی نئے باری علیگ کا انکشاف ہوا۔

ہمارے ہاں تین قسم کی تاریخ کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

نمبر ایک: اسکول اور کالج کے طلبا کیلئے جن میں سن ہوتے ہیں، جنگیں ہوتی ہیں۔ ولی

عہد بادشاہ کو قتل کر رہا ہوتا ہے یا بادشاہ اپنے دشمنوں کی گردنیں اُڑا رہا ہوتا ہے۔

نمبر دو: پبلشروں کیلئے۔ جن میں پبلشر کی پسند کے تاریخی واقعات لکھے جاتے ہیں۔

نمبر تین: مال کمانے کیلئے۔ ایسی کتاب بہت سی تاریخی کتابوں کو سامنے رکھ کر ان میں سے ایک کتاب نکال لی جاتی ہے۔

تاریخ کی کتابوں کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جس میں مستند تاریخی حوالے ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کے ادوار کو ترتیب کے ساتھ دہرایا جاتا ہے اور بس۔

تاریخی کتابوں کی ایک سب سے الگ قسم بھی ہے جس کا چشمہ ابنِ خلدون کی وادی سے پھوٹتا ہے۔ یہاں ہمیں تاریخ ایک سائنس کی حیثیت سے ملتی ہے۔ ایسی کتاب لکھنے والا ہمیں بتاتا ہے کہ جو واقعات آج سے پانچ ہزار سال پہلے کسی قوم پر گزر چکے ہیں، اگر ویسے حالات و کوائف ہماری صدی میں بھی کسی معاشرے میں پیدا ہو جائیں تو وہی واقعات ایک بار پھر دہرائے جا سکتے ہیں، وہی سانحہ ایک بار پھر گزر سکتا ہے۔ یہ وہ تاریخ کی کتاب ہوتی ہے جس کے بارے میں باری علیگ صاحب نے ''تاریخ کا مطالعہ'' کے شروع میں لکھا تھا کہ:

''تاریخ ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہے۔ ہم اس سے سبق کیوں نہیں حاصل کرتے؟''

یہاں تاریخ ایک منطق ہے۔ ایک فعل ہے۔ ایک نتیجہ ہے۔ نیچر کے عوامل ہیں۔

باری علیگ کی اس کتاب میں مجھے یہی منطق، یہی افعال، یہی نتائج اور نیچر کے یہی عوامل ہر صفحے پر دکھائی دیئے ہیں۔ ایسا لگا جیسے تاریخ میرے ساتھ ساتھ ہے۔ وہ گزری نہیں۔ وہ داستان گزشتہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت کی شکل میں میرے ساتھ سانس لیتی اور میرے دل کے ساتھ دھڑک رہی ہے۔ جدھر میں جاتا ہوں اُدھر وہ بھی جاتی ہے۔ میں برائی کرتا ہوں۔ وہ مجھے سزا دیتی ہے۔ میں اچھا عمل کرتا ہوں۔ وہ مجھے اس کا اچھا ثمر عطا کرتی ہے۔ میں غفلت سے کام لیتا ہوں۔ وہ مجھے سزا دیتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں زمانے کا ترازو ہے۔ جس کا پلڑا وہ کبھی جھکنے نہیں دیتی۔ ہمیں اپنا بویا ہوا ہی کاٹنا ہوگا۔ ریت پر اُٹھی ہوئی عمارت گر پڑتی ہے۔ محل ایک روز کھنڈر بن جاتے ہیں۔ کھنڈر ریت بن کر ہوا کے ساتھ اُڑ جاتے ہیں۔ صرف اچھا خیال زندہ رہتا ہے۔ اچھائی کا احساس زندہ رہتا ہے۔ لاش ممی بن کر دس ہزار سال تک باقی رہ سکتی ہے، مگر وہ ہمیں سوائے عبرت کے اور کچھ نہیں دے سکتی۔ نیک خیال، نیک عمل کو ہی بقا ہے اور تاریخ ہمیں یہی کچھ سکھاتی ہے۔

ہم اس سے سبق کیوں نہیں حاصل کرتے؟

اس کتاب میں باری علیگ نے تاریخ کے اسی کردار کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے اوراق میں ہمیں شہنشاہوں کے شاہانہ لباس دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کے دل و دماغ انسانیت کی بھلائی اور برائی کیلئے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم اُنہیں اپنے ہی خنجر اپنے سینوں میں گھونپتے دیکھتے ہیں۔ یہاں زمانے کو قبل از مسیح اور بعد از مسیح کے ادوار میں تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ اس تاریخ کی لوح محفوظ پر لکھی ہوئی وہ تحریر دکھائی گئی ہے جسے ہر دور میں معاشرے کا فرد اپنے کردار کے قلم سے تحریر کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ اچھا یا بُرا ہر دور میں یکساں مرتب ہوتا ہے۔

باری علیگ کی ایک نئی شخصیت کو میں نے اس کتاب کے اُفق سے طلوع ہوتے دیکھا۔ میں نے اس کتاب کو بار بار پڑھا اور کئی لوگوں کو پڑھنے کیلئے دی۔ چنانچہ آج یہ کتاب میرے پاس نہیں ہے لیکن اس کا عکس میرے دل و دماغ میں محفوظ ہے۔ کتاب نے اپنا رول ادا کر دیا ہے۔ اصل میرے دل کے نہاں خانے میں ہے اور نقل مجھ سے کوئی واپس نہ کرنے کیلئے لے گیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ یہ کتاب کسی دوسرے کے پاس ہے۔ کیونکہ ابھی اس کو پڑھے جانے کی ضرورت ہے اور اگر اُسے کوئی نہیں پڑھ رہا ہو گا اور وہ کتاب کسی الماری میں بند پڑی ہو گی جب بھی وہ اپنا رول ادا کر رہی ہو گی۔ زندہ کتابیں بند ہو کر بھی کھلی ہوتی ہیں۔ ان کے اوراق دھڑک رہے ہوتے ہیں۔ ان کے لفظ بول رہے ہوتے ہیں۔

'تاریخ کا مطالعہ' میں باری علیگ کا اسلوب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ 'کمپنی کی حکومت' اور 'کارل مارکس' والا باری علیگ نہیں ہے۔ یہ کوئی قد آور جن ہے جو کتاب کی بوتل میں بند ہو کر اپنی کرامتیں دکھا رہا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا آسان ہے مگر کوزے میں رہ کر سمندروں کے بلا خیز طوفان برپا کرنا بہت مشکل کام ہے اور باری علیگ نے یہ کام کر دکھایا ہے۔

وہ چھوٹے چھوٹے فقروں کے ہار پروتا ہے۔ ایک ایک لفظ کو تراش خراش کر چمکا لشکا کر اس میں جڑتا ہے۔ فقرے کتاب سے باہر آ کر باتیں کرتے ہیں۔ لفظوں کے سیپ کہیں نظر نہیں آتے۔ مفہوم کے موتی جگہ جگہ چمکتے ہیں۔ یہ بہار کے جوشِ نمو کا اسلوب ہے۔ بادلوں کے گرجنے، بجلی کے چمکنے اور بارش کے برسنے کا اسلوب ہے۔ ایک تاریخی واقعہ بیان

کیا جاتا ہے اس کا آغاز و انجام بیان کیا جاتا ہے اور پھر باری علیگ اپنی طرف سے ایک فقرہ لکھتا ہے جس میں اس تاریخی واقعے پر زمانے کی مہرِ تصدیق کی صدا سنائی دیتی ہے۔

میں یہاں مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

باری علیگ گوتم بدھ کے باب میں اس عظیم انسان دوست شہزادے کی زندگی کی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے اس رات کا ذکر کرتا ہے جب شہزادہ سدھارتھ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے محل کا عیش و آرام چھوڑ دینے کیلئے اپنے شاہانہ بستر سے اُٹھتا ہے۔ کوئی صدا بار بار اس کے کانوں میں سرگوشی کرتی ہے کہ اے شہزادے! تمہیں دُنیا بھر کے انسانوں اور حیوانوں کے دکھ درد دور کرنے کیلئے محل کو چھوڑنا ہے۔ بیوی بچوں سے جدا ہونا ہے۔ شہزادہ سدھارتھ سوئی ہوئی بیوی اور بچے کے معصوم چہروں کو دیکھتا ہے۔ وہ سوئی ہوئی بیوی کے قدم چومتا ہے۔ اپنے معصوم بیٹے راہل کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے اور چپکے سے محل سے نکل جاتا ہے۔ یہاں باری علیگ ایک فقرہ لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''شہزادہ گوتم اس محل کو ہنسی خوشی اپنی مرضی سے چھوڑ رہا ہے جس میں داخل ہونے کی خواہش نے انسانی تاریخ کو خونیں بنا رکھا ہے۔''

یہ باری علیگ کا وہ اسلوب تحریر ہے جو واقعات کی کڑیاں جوڑتا ہے اور افعال و عوامل کو سامنے رکھ کر نتائج مرتب کرتا ہے اور پھر اس پر بڑے طنزیہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے جو اس کا نہیں بلکہ تاریخ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ زمانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔

باری علیگ کا ایک اور اسلوب بھی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے اسلوب کے تند و تیز دریا کا ایک دوسرا دھارا بھی ہے۔ یہاں وہ ایک واقعہ بیان کر کے آنے والے دور کی ایک تصویر دکھاتا ہے۔ مثلاً اسی کتاب میں جہاں وہ 'ایران' کا باب ختم کر رہا ہے وہاں وہ لکھتا ہے کہ دجلہ کے کنارے خسرو پرویز کی بزمِ نشاط گرم ہے۔ کنیزیں جام پہ جام پیش کر رہی ہیں۔ بادشاہ عالم مدہوش میں ہے کہ ایک عرب بدو حضور نبی اکرم ﷺ کا خط لا کر پیش کرتا ہے جس میں قبول اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ خسرو پرویز خط پڑھ کر قہقہہ لگاتا ہے اور اُسے پُرزے پُرزے کر کے دریائے دجلہ میں پھینک دیتا ہے۔

اس مقام پر باری علیگ اس باب کا آخری جملہ لکھتا ہے کہ ...

''سلطنت ایران کے بھی اسی طرح پرزے اُڑنے والے ہیں۔''

اور اس کے آگے ''سرزمین عرب'' کا باب شروع ہوتا ہے۔

بخت نصر نے اپنی نو بیاہی ملکہ کیلئے محل کی چھت پر معلق باغات لگوائے کیونکہ وہ سرسبز و شاداب علاقے سے آئی تھی اور صحرا میں اداس تھی۔ نہ بخت نصر رہا نہ اُس کی ملکہ رہی اور نہ معلق باغات رہے۔ جو رہی سو بے خبری رہی۔

تاریخ کا مطالعہ مٹ جانے والے بے ثبات جذبوں کے قدرتی زوال اور ہمیشہ زندہ رہنے والی قدروں کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ ڈوبتے جہاز پر سوار ہونے والا جہاز کے ساتھ ہی ڈوب جاتا ہے۔

اس کتاب کا ایک موڈ، ایک آہنگ، ایک آدرش ہے۔ باری علیگ نے یہ کتاب تاریخ کے امتحانی پرچے حل کرنے کیلئے نہیں لکھی نہ اس نے سلطنتوں کے عروج و زوال کا ریکارڈ جمع کیا ہے اور نہ ہی اس نے صدیوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ اس نے تاریخ کو اپنے خون میں حل کر کے کتاب کے اوراق پر نقش کیا ہے۔ بہت کچھ پڑھنے، بہت کچھ سوچنے، بہت کچھ محسوس کرنے اور بہت کچھ ہضم کرنے کے بعد باری علیگ نے بہت تھوڑا بیان کیا ہے۔ یقیناً بہت تھوڑے لوگوں کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے۔ یہ تو ان لوگوں کا حصہ ہے جو اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ یہ وہ کتاب نہیں ہے جو فروخت کیلئے کسی دکان کے اسٹال پر بے جان لاش کی طرح پڑی ہو اور جس کے اوراق سے مشک کافور کی بُو آتی ہو اور جو اپنی تدفین کا انتظار کر رہی ہو۔

'تاریخ کا مطالعہ' ایک زندہ کتاب ہے۔ باری علیگ سے بھی زیادہ زندہ اور وہ تاریخ کے پھول کی خوشبو بن کر ہوا میں بکھر چکی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کیلئے نظر کی نہیں، مشامِ تیز کی ضرورت ہے ؎

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

مکتبہ اُردو والوں نے پھر یہ کتاب شائع نہیں کی۔ بہت اچھا کیا۔ مجھے یقین ہے اس کا پہلا ایڈیشن بھی نہیں بکا ہو گا۔ یہ بھی بہت اچھا ہوا۔ اس کی ٹائپ بھی اچھی نہیں تھی۔ میں نے بھی یہ کتاب کسی کو دے دی تھی اور مجھے یقین ہے کہ اس کے ہاتھ سے بھی یہ کتاب اُڑ گئی ہو گی۔ یہ کتاب ایک نیک خیال کا سفر ہے۔ اُسے ہمیشہ سفر کرتے رہنا چاہیے اور صرف اس دل میں ایک پل کیلئے رُکنا ہے جس کی کھیتی اس بیج کی آب یاری کیلئے تیار ہو۔ بارش کا ہر قطرہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر گر سکتا ہے لیکن بارش کا وہ قطرہ جو موتی بنتا ہے،

صرف سیپ کے منہ میں گرتا ہے۔
اس کتاب کو پڑھنے اس سے بغل گیر ہونے کے بعد میں باری صاحب کی تلاش میں نکلا تو پتہ چلا کہ باری صاحب تو انتقال کر چکے ہیں۔ مگر باری علیگ زندہ ہے۔

☆☆☆☆☆

درج ذیل لنک پر باری علیگ کی چند ایسی تصاویر ہیں جو شاید آپ کی نظر سے اس سے قبل نہ گزری ہوں:

https://www.flickr.com/photos/rashid_ashraf/15722242944/

حواشی:

[۱]۔ کیپٹن ممتاز ملک، اے حمید کے بہنوئی تھے۔ ریڈیو سیلون کے زمانے کی ان کی ایک انتہائی کمیاب تصویر جس میں اے حمید بھی موجود ہیں، یہاں ملاحظہ کیجیے:

https://www.flickr.com/photos/rashid_ashraf/10624960004/

[۲]۔ یہاں مصنف کو سہو ہوا ہے۔ ان صاحب کا نام غلام عباس نہیں بلکہ حسن عباس تھا۔ یہ منٹو کے بچپن کے دوست تھے۔ جس 'معرکے' کے مضمون کا حوالہ مصنف نے دیا ہے اسے ''اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے'' کی جلداول (اپریل ۲۰۱۶ء) میں شامل کیا تھا۔ مذکورہ کتابیں اٹلانٹس پبلی کیشنز نے شائع کی تھی۔ حسن عباس کا انتقال ۹ نومبر ۱۹۸۳ء کو کراچی میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۳ برس تھی۔ ان کی تدفین سخی حسن قبرستان میں کی گئی تھی۔